جدید مرثیہ

تیس مضامین کا مجموعہ

جریدہ 'عکاس' اسلام آباد کی کتاب دس سے ماخوذ

یہ کتاب برقی شکل میں نشر ہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسنین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

جدید مرثیہ

تین مضامین کا مجموعہ جریدہ 'عکاس'

اسلام آباد کی کتاب دس سے ماخوذ

جمع و ترتیب: اعجاز عبید

ماخذ: اردو کی برقی کتاب

***

جدید اُردو مرثیہ

(چند حقائق، چند معروضات)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن (لاہور)

شعر و ادب میں ایسے واقعات زیادہ اہم قرار پاتے ہیں جو انسان کی اجتماعی زندگی اور معاشرت پر براہ راست اثرانداز ہوتے ہیں۔ واقعۂ کربلا محض ایک تخئیلی داستان نہیں بلکہ اس واقعے میں معاشرت کرنے کے اعلیٰ اقدار مل جائیں گے۔ یہی سبب ہے کہ دوسرے تاریخی واقعات کی بہ نسبت واقعۂ کربلا نے انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ حق گوئی، مظلومیت اور تمرّد کے خلاف جہاد کرنا، یہ ایسے اعلیٰ اقدار ہیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ معاشروں کو متاثر کیا بلکہ اس کے اثرات ادب و شعر پر بھی مرتسم ہوئے۔ (۱) یہی سبب ہے کہ اعلیٰ قدروں کی ترویج کے لئے کربلا کو استعارہ بنایا گیا (۲) اور ان استعاروں اور تلازموں سے نہایت عمدہ اور کارگر شہ پارے تخلیق کئے گئے۔ (۳،۴)

معروف و غیر معروف ناقدین، محققین اور دانشوروں کی جانب سے بالعموم یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ واقعۂ کربلا نے مختلف اصنافِ شعر و ادب کو متاثر کیا، بطور ثبوت غزل، داستان، افسانہ، مثنوی، ناول، نظم، ناولٹ، سفرنامہ، رپورتاژ اور دیگر اصناف منّت سے چیدہ چیدہ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ کربلا نے محض شعر و ادب ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ اُردو شاعری کو متعدد اصناف سے مالا مال بھی کیا۔ آپ سلام، نوحہ اور مرثیہ کا بغور مطالعہ فرمائیے اور اس سوال کا کھوج لگائیے کہ کیا واقعہ کربلا کے بغیر ان اصناف کا ظہور میں آنا ممکن تھا؟؟ صنفِ مرثیہ وہ ممتاز صنف ہے، جس کا خمیر اسی برصغیر میں تیار ہوا اور یہی وہ صنف ہے کہ جس میں اُردو کے بیشتر اصناف کے محاسن کا جوہر مل جاتا ہے۔ (۵) اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ مرثیے کی صنف کو برصغیر پاک و ہند سے جو خصوصیت ہے وہ کسی دوسری صنف کو حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ سلام و نوحہ بھی صنفِ مرثیہ کی توسیع ہیں۔

مرثیہ، سلام اور نوحے کے اصناف ہر عہد مں اس لئے مقبولِ خاص و عام رہے کہ ان منّہ زندگی کی اعلیٰ قدریں پیش کی جاتی رہنّر اور اسی سبب سے ان کے ذریعے اعلیٰ تر معاشرتی رویّے ظاہر ہوئے۔ آج بھی مذکورہ اصناف منّی واقعۂ کربلا کے حوالے سے زندگی بسر کرنے کے بہترین تصورات مل جائں گے۔[۶] واقعۂ کربلا کا یہ فیضان ہے کہ اس نے ایک سطح پر تو انسان کا تعلق خدا سے اور دوسری سطح پر انسان کا تعلق اعلیٰ تر معاشرتی اقدار سے جوڑ دیا ہے۔ عصرِ حاضر منّک ایسے شعراء کی ایک کثیر تعداد موجود ہے، جو ان اصناف کے حوالے سے معاشرے منّں مثبت اقدار کو فروغ دینے منّر مصروف ہے۔

لکھنو برصغیر کی تہذیب و ثقافت کا سب سے بڑا مرکز تھا، یہی سبب ہے کہ جملہ فنونِ لطیفہ یہاں اوجِ کمال تک پہنچے۔ نثر ہو یا شاعری، یہاں کے تخلیق کاروں نے ہر میدان منّن اپنی صناعانہ تخلیقی ہنر مندیوں کا ثبوت دیا۔ فن کے اظہار کے لئے نئے نئے راستے تلاش کئے جانے لگے۔[۷] خارجیت اور ڈرامائی عناصر کے امتزاج سے لکھنؤ مں ایک منفرد شعری فضا تشکیل پانے لگی۔[۸] اسی صورتِ حال مںی خارجیت، ڈرامائی عناصر اور واقعۂ کربلا کے مثلث نے صنفِ مرثیہ کا تخلیق نامہ مرتب کیا۔ برصغیر کی سرزمین کا طرزِ احساس اور اس کے تہذیبی اثرات نیز عرب کے تاریخی واقعات و عوامل انیس و دبیر کے مرثیوں منّی یکجا ہو کر فن کی انتہائی بلندیوں کو چھونے لگے۔ ان دونوں حضرات نے مرثیے کے تخلیقی امکانات کو وسیع کیا[۹] اور اپنے بہترین افکار کو اپنے متنوع اسالیب مں پیش کر کے ہر عہد کے شعراء کو متاثر کیا۔ (۱۰) تا اینکہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ انیس و دبیر نے برصغیر کے تہذیبی عناصر کو جس طرح اپنے مرثیوں منّا محفوظ کیا تھا، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ان کے مرثیوں کے مطالعے سے ہم آج بھی برصغیر کی اسلامی تہذیب و ثقافت کا کھوج لگا سکتے ہنّا۔[۱۱]

بیسویں صدی منّس ہندوستانی معاشرت پر طرح طرح کے بین الاقوامی سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ انیس و دبیر کا لکھنؤ زوال آمادہ تھا اور عظیم تہذیبی روایات دم توڑ رہی تھنّب۔ تاہم بقول سیّد عاشور کاظمی :

''۱۸۵۷ء کے بعد اودھ کی تہذیب کو مٹانے کی کوششوں کے باوجود لکھنو گہوارۂ علم و ادب تھا میر انیس کا شہر لکھنو، رثائی ادب کا شہر لکھنو، تہذیبِ سیادت کا شہر لکھنو، وہ شہر جو دماغ وضع کرتا تھا۔ وہ شہر جو پتھروں کو دل بنا دیتا تھا۔(۱۲)

دانش مند کہتے ہنّی کہ جب چراغ بجھنے لگتا ہے تو اس کی لَو تیز ہو جاتی ہے۔ کچھ یہی صورتِ حال لکھنو منّس بھی تھی کہ زوال آمادگی کے باوجود یہاں متداولہ علوم و فنون ترقی کر رہے تھے اور یہاں کی چمک دمک نو واردان کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز ہی منّد مختلف تاریخی، سیاسی، سماجی اور معاشی اسباب کی بنا پر برصغیر پاک و ہند کے معاشرے منّس شکست و ریخت کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس حوالے سے پہلے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی رائے ملاحظہ فرمائیے

''انگریز حاکم ہندوستان کی محکوم اور ''وحشی'' رعایا کو زیادہ سے زیادہ ''متمدّن'' بنانا چاہتے تھے تاکہ ان کا معیار زندگی اعلیٰ سطح پر آجائے اور نتیجتاً وہ ان اشیائے تجارت کی کھپت کر سکنّز جو انگلستان کی ملوں منّے تیار ہوتی ہں ۔ ''(۱۳)

اس معاشرتی بے کلی اور ٹوٹ پھوٹ کا نتیجہ یہ بر آمد ہوا کہ پورے معاشرے منّا اب کیا ہو گا ؟؟؟ کے اندیشے پائے جانے لگے۔ اس صورت حال نے دوسرے دوائر کی طرح ادب کے دائرے کو بھی متاثر کیا۔ سر سید نے تہذیب الاخلاق کے اجرا سے اپنے تئیں معاشرے کو سدھار لیا جبکہ حالی نے مسدس مد و جزرِ اسلام لکھ کر تہذیب الاخلاق کی منظوم شرح کر کے سر سید سے حق دوستی ادا کر دیا۔ (۱۴)

آپ اس دور کے شعر و ادب کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ گومگو اور پژمردہ صورت حال کے سبب سے شعر و ادب مں ایک طرف تو مایوسی، اضمحلال اور تھکن کا لہجہ ظاہر ہوا اور دوسرے رخ پر اس کے ردِ عمل منّ ایک تند و تیز، گھمبیر اور دبنگ لہجہ معرضِ وجود منّل آگیا۔ ان دونوں لہجوں کا مطالعہ کیجئے تو یہ ایک ہی جیسے حالات کا نتیجہ ثابت ہوں گے۔ اس زمانے منّض سامسی اور معاشی صورت حال کی وجہ سے شعر و ادب مں بھی ایک زبردست مزاحمت اور احتجاج کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی[۱۵]۔ بیشتر اصناف اپنا اپنا چولا بدل رہے تھے۔ چنانچہ مرثیے نے بھی عصری مسائل کو جذب کیا۔ [۱۶]یہی سبب ہے کہ بیسویں صدی کے بیشتر مسائل آپ کو اس زمانے کے مرثیوں مں ضرور ملنّی گے۔ اس سلسلے مں ڈاکٹر ہلال نقوی کی رائے بھی ملاحظہ فرما لیجئے :

''بیسویں صدی منّب مرثیے کا نیا سفر برصغیر کے اس زوال پذیر معاشرے کی دہلیز سے شروع ہوتا ہے جس مں فیوڈل سسٹم کے نئے جال بنے جا رہے تھے اور انگریزوں کی حاکمیت اس خطے منّر اپنے نظام فکر کے بیج بو رہی تھی۔[۱۷]''

بیسویں صدی کا سورج نئے نظریات و میلانات لے کر طلوع ہوا اور خصوصاً مغربی اصناف کے حوالے سے اُردو اصناف منّ جدید افکار و نظریات کی ضرورت کا احساس پیدا ہونے لگا۔ [۱۸] مغربی تہذیب نے اپنی رنگارنگی کی وجہ سے اہلِ مشرق کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ سوچ اور فکر کے مروجہ معیارات تبدیل ہونے لگے۔ پرانے پیمانے بوسیدہ قرار دیئے گئے اور اب نئے شعری پیمانوں منّب جدید شراب کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ شعر و ادب کا تعلق فرد سے زیادہ معاشرے سے جوڑا جانے لگا اور اجتماعی لب و لہجہ کو اہمیت ملی۔[۱۹] نتیجتاً قومی اور ملی شاعری کو عروج حاصل ہوا اور مذہبی مرثیوں کی جگہ قومی اور شخصی مرثیوں نے لے لی، اقبالؔ، نظم طباطبائی، صفی لکھنوی، ریاض خیرآبادی، اثر لکھنوی اور چکبست لکھنوی وغیرہ نے قومی اور ملی مرثیوں کے ذریعے ملت کو بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی۔(۲۰) اس طرح مرثیے کا رشتہ قومی شاعری سے جڑ گیا۔ بعض ناقدین نے اس منظر نامے کے حوالے سے سطحی بنیاد پر یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ اس عہد منّی ''مذہبی مرثیہ'' کو زوال آگیا تھا [۲۱] مگر حقیقتاً ایسا نہن ہے۔[۲۲] اگر آپ بنظر غائر دیکھیں تو قومی اور ملی مرثیے بھی دراصل اسی روایتی مرثیے کا ایک جدید رُوپ ہنّن۔ اب اس حوالے سے صرف دو بند ملاحظہ فرمائیے اور مذہبی مرثیے کا اثر شخصی اور ملی مرثیہ پر ملاحظہ کیجئے ؎

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور

*

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبت مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

*

بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں
(علامہ. اقبالؔ)

* * *

یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا

*

یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا

*

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ''ہوم رول'' کے بدلے

(چکبستؔ. لکھنوی)

* * *

بیسویں صدی کی دوسری دہائی منّت پوری دنیا منّک عموماً اور مختلف اسباب کی بناء پر ہندوستان منّم خصوصاً اجتماعی شعور بیدار ہو رہا تھا۔ ایسے لائحہ عمل مرتب کئے جا رہے تھے، جن سے معاشرتی سطح پر انقلابی تبدیلیاں لائی جا سکنّی۔ (۲۳) اس حوالے سے مظلوم دیسی عوام کے اوپر کئے گئے مظالم کو مختلف سطحوں پر پیش کر کے سامراجی استبداد اور ظالمانہ حیثیت کو خوب اُبھارا جا رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد عوام الناس منّو ایک انقلابی رجحان پیدا کرنے کے لئے واقعہ کربلا اور حضرت امام حسین علیہ السلام کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا جانے لگا تھا۔(۲۴) اس روّیے کو مرثیہ گو شعراء بھی محسوس کر رہے تھے۔ (۲۵)دولہا صاحب عروج کے مرثیے کا یہ شعر اس عہد کے بدلتے ہوئے رجحانات و میلانات کی نمائندگی کرتا ہے ؎

ظلمت کدے میں ہوں پہ تجلی پسند ہوں
میں ہوں عروجؔ کیوں نہ ترقی پسند ہوں

* * *

اس سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورتِ حال کا اُردو مرثیے کی ہئیت پر تو زیادہ اثر نہ ہو سکا لیکن موضوعات اور مواد کے اعتبار سے اس منّج دُور رس تبدیلیاں رونما ہوئنّو۔ خاص طور پر شہادتِ امام حسین علیہ السلام کے بعد کے حالات و واقعات کو بطورِ خاص مرثیوں منّی جگہ دی جانے لگی اور پیغامِ امام عالی مقام کی تشہیر ہی اس کا بنیادی موضوع قرار پایا۔(۲۶) اس سلسلے مں آلِ رضا، نجم آفندی، نسیم امروہوی، جمیل مظہری، علی سردار جعفری اور جوش ملیح آبادی نے جس طرح مرثیے کو مقصدی لے عطا کی اور اس صنف کو جدید عصری تقاضوں کے عین مطابق ڈھالنے کی کوشش کی، اس کی جتنی بھی مدح کی جائے کم ہے۔ آلِ رضا اور جمیل مظہری نے مرثیے کے مزاج و مذاق منّا تبدیلی پیدا کرنے کی کوششنّھ کنّی۔ (۲۷) جوش نے انفرادی طور پر مرثیے کو رولانے کی بجائے جگانے کا ہتھیار بنایا۔ (۲۸)

نسیم امروہوی نے زبان و بیان کی نزاکتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مرثیے منّج ہیٔت کے کامیاب تجربے کئے۔ [۲۹] اس طرح ان قد آور مرثیہ نگاروں کی کاوشوں کے نتیجے منٔیٔ مرثیے کو ایک مرتبہ پھر عروج حاصل ہوا اور فنی و فکری ہر لحاظ سے یہ صنف دوسرے وقیع اصناف کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ ان معروف مرثیہ نگاروں کے درج ذیل بندوں کا مطالعہ کیجئے اور دیکھیئے کہ اس زمانے منّق مرثیہ کس طرح اپنے اندر عصری شعور کے سبب تبدیلی پیدا کر رہا تھا ؎

اہلِ زمین کی چاند ستاروں پہ ہے نظر
ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر

*

ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر
مردانِ حق پرست کا جانا ہوا اگر

*

عباسؑ نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند پر حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

(نجم.آفندی)

* * *

اے قوم وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ
اسلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ

*

کیوں چُپ ہے اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ
تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ

*

مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ ابنِ علیؑ ہو
(جوشؔ ملیح آبادی)

* * *

حضرت نے کہا کہ رونے والو!
اب چپ رہو دل ذرا سنبھالو

*

اشکوں کا وفور ہو تو ٹالو
ہمت سے یہ بارِ غم اُٹھا لو

*

پیغامِ مشیّت آگیا ہے
ہنگامِ وصیّت آگیا ہے
(نسیمؔ امروہوی)

* * *

ان جدید مرثیہ نگاروں کا لگایا ہوا تخم ثمر دار ہوا اور بہت سے ایسے مرثیہ نگار ظاہر ہوئے جنہوں نے اپنے افکار عالیات کے ذریعے اس صنف کو مالا مال کیا۔ یہی سبب ہے کہ اس دور مں ہر قابلِ قدر شاعر نے صنفِ مرثیہ منّث طبع آزمائی کی۔ ان شعراء مں قمرؔ جلالوی، شوکتؔ تھانوی، علامہ محسن اعظم گڑھی، ڈاکٹر یاور عباسؔ، راجہ صاحب محمود آباد، عزمؔ جونپوری، رئیسؔ امروہوی، راغبؔ مراد آبادی، ڈاکٹر صفدرؔ حسین، کمرا رنوریؔ اور فیض احمد فیضؔ کے اسمائے گرامی بطور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

موجودہ دور ذہنی و فکری انتشار کا دور ہے۔ جب معاشرے منّر منتشر قوتنّج فروغ پا رہی ہوں تو انسان اپنے اندر سمٹنا شروع کر دیتا ہے۔ چیزوں منّع اختصار کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے اور اصنافِ شعر بھی مختصر سے مختصر ترین ہوتے چلے جاتے ہنّچ۔ اس کے علاوہ معاشی مسائل، سماجی حالات اور اندرونی بے چینیاں بھی انسان کو بے کل کر دیتی ہنّا۔ اب قارئین ان اصنافِ ادب و شعر کو اہمیت دیتے ہنّا، جو ان کے عصری مسائل سے ہم آہنگ ہوں اور ان کے مسائل کا تسلی بخش حل پیش کر سکنّو۔ مرثیہ بھی ان عمرانی حالات سے دوچار ہوا مگر اپنے مزاج کے سبب اس صنف نے جلد ہی عمرانی تقاضوں کو سمجھا اور اپنے اندر تبدیلیوں کی اجازت دے دی۔[۳۰] نتیجتاً موجودہ مرثیہ نگاروں نے مرثیے مں جدید نفسیاتی، سماجی اور سیاسی مسائل کو نہ صرف یہ کہ پیش کیا بلکہ ان کے حل کے لئے نسخے بھی تجویز فرمائے۔ عہدِ جدید منّا صباؔ اکبر آبادی، شاہدؔ نقوی، سہیلؔ بنارسی، شائقؔ زیدی، ساحر لکھنویؔ، ڈاکٹر عاصی کرنالی، خیال امروہوی، مظفر نقوی، سردارؔ نقوی، ظہوؔر جارچوی، وحید الحسنؔ ہاشمی، سیفؔ زلفی، عبدالروؤف عروجؔ، افسر عباسؔ زیدی، ظفر شاربؔ، اثرؔ ترابی، حسن عسکریؔ کاظمی، اثرؔ جلیلی، سید فیضیؔ، ہلالؔ نقوی، امیدؔ فاضلی، قسیمؔ امروہوی، اسیرؔ فیض آبادی، شیداؔ حسن زیدی، میر رضیؔ میر، عارفؔ امام، احمد نویدؔ، کوثرؔ امروہوی، عرفی ہاشمی، علی رضا کاظمی، حشمت علی قنبر، طاہر ناصر علی وغیرہ کے مرثیوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ان شعراء نے فنی اور فکری سطح پر مرثیے کو عہد جدید سے پیوست کر دیا ہے۔[۳۱]

بیسویں صدی کے آخر منّی جس شاعر نے مرثیے منّض فکر انگیز اور اجتہادی تبدیلیاں کنّی اور اسے مقبولِ خاص و عام بنایا [۳۲] وہ قیصرؔ بارہوی تھے۔ انہوں نے مرثیے کو واقعۂ کربلا کی خیرہ کر دینے والی روشنی مسب ایک عالی شان فتح کا نقارہ بنا دیا ہے ؎

کربلا جس کی بلندی ہے وہ مینارہ ہے
مرثیہ سب سے بڑی فتح کا نقارہ ہے

* * *

عصرِ حاضر کے انحطاط پذیر معاشرے مں اخلاقی قدروں کی آبیاری کرنا کسی جہاد سے کم نہنّب ہے۔ مخرب اخلاق رسوم و رواج نے لوگوں کو ذہنی طور پر ماؤف بلکہ مفلوج کر دیا ہے۔ افراد معاشرے اور معاشرہ فرد سے لاتعلق ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ صورتِ حال ہمارے دور منّر اِس لیے مزید لائق توجہ ہو گئی ہے کہ اب عوام الناس کا ادب اور ادیبوں سے اعتبار اُٹھتا جا رہا ہے۔ ایک عام تاثر یہ ہے کہ ہمارا شعر و ادب معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ نہں ہے لہٰذا اس کا مطالعہ اپنے قیمتی وقت کا ضیاع ہے۔ اس طرزِ احساس کا اثر ہمارے مرثیہ نگاروں پر بھی ہوا ہے۔ ایک جدید مرثیہ نگار کے درج ذیل پانچ بندوں کا مطالعہ فرمائیے اور بدلتے ہوئے ادبی حالات اور قوانین کا ذہنی بصیرت و بصارت سے تجزیہ فرمائیے :

سائنس کا ادیب نے دیکھا جو ارتقا
ٹیکنالوجی کو اپنا مقابل سمجھ لیا

*

یوں کشمکش کی زد میں ادب کا سفر ہوا
آندھی سے شب کی جنگ ہوئی بجھ گیا دیا

*

کل جو ادب تھا ابرِ گہر بار کی طرح
اب بانجھ ہے لُٹے ہوئے بازار کی طرح

*

بتلائیں جو ہیں آج کی دنیا سے بے خبر
وہ کیا ہے جس کو کہتے ہیں تخلیق کا سفر

*

ہٹ جائے راستے سے تو یوں ہے وہ راہبر
جس طرح کور چشم کی سورج پہ ہو نظر

*

اِک داغ ہے وہ دامنِ افکار کے لیے
تخلیق جس ادب کی ہو بازار کے لیے

* * *

دلچسپ کس قدر ہے تماشائے زندگی
راہِ عمل سے کٹ کے کہاں جائے زندگی
ایسے ادب سے خود کو جو بہلائے زندگی
عبرت کے مدفنوں میں نظر آئے زندگی
کیا زندگی کا ایسے ادب سے نباہ ہو
فٹ پاتھ جس کی آخری آرام گاہ ہو

* * *

ایسا ادب کہ جس میں پیامِ عمل نہ ہو
دامن میں مسئلے ہوں مگر ان کا حل نہ ہو
تاریک جس کی آج ہو، تابندہ کل نہ ہو
کس طرح اس کی تاک میں دیوِ اجل نہ ہو
اس زیست کو اجل کی ضرورت شدید ہے
کاہل کی موت قوم کے حق میں مفید ہے

* * *

جب منزلِ عمل سے ہوا دُور یہ ادب
ہر زاویے سے ہو گیا مقہور یہ ادب
بھٹکے ہوئے شعور کا منشور یہ ادب
اُجرت عذابِ زیست ہے مزدور یہ ادب
اُجڑا ہوا ہے مصر کے بازار کی طرح
تاریک ہے یزید کے کردار کی طرح
(سیّد عرفی ہاشمی)

* * *

دانش مندوں کا کہنا ہے کہ اب یہ وسیع و عریض دنیا گلوبل ویلیج اور گلوبل ہٹ سے سمٹتی ہوئی آنکھ کی پتلی مںن سما گئی ہے۔ اس صورتِ حال منّع ہمارے ادب اور خصوصاً مرثیے کو بین الاقوامی صورتِ حال کے مطابق ہونا چاہیے۔ اب ہماری زندگی کا مدار تبدیل ہو رہا ہے۔ اخلاقیات کی سرحدیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہںّہ۔ معیشت کا جن بوتل سے باہر نکل آیا ہے اور ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقیوں نے انسانی ذہن کے معیارات کو مسمار کرنا شروع کر دیا ہے۔ آئیے ایک نوخیز مرثیہ نگار کے خیالات سے آپ کو آگاہ کر دوں:

''اس حقیقت سے انحراف ممکن نہںخ کہ عالمی ادب، پاکستانی ادب اور پاکستانی ادب منّد رثائی ادب کے قارئین کی تعداد روز بروز کم ہو رہی ہے۔ مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ ہمارے تہذیبی تشخص کی بنیاد اب شعر و ادب پر نہں بلکہ معیشت اور ٹیکنالوجی پر استوار ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک طرف بین الاقوامی، قومی اور علاقائی کلچر اور دوسری جانب شخصیت کو تشکیل دینے والے بنیادی رجحانات کے پیچھے بھی یہی دو عوامل کارفرما نظر آتے ہںچ۔ نوّے فیصد سے زیادہ افراد پہلے ہی اس بات پر قائل ہںّب کہ معیشت و ٹیکنالوجی سے تعلق خاطر نہ رکھنے پر انہںّ سماجی حیثیت اور مادی فوائد کے حصول مں شدید رکاوٹںّ درپیش ہںک۔ اب سوچنا یہ ہے کہ پاکستانی ادب اور پاکستانی ادب منّف رثائی ادب کس کے لیے تخلیق کیا جائے؟ ''ادب برائے زندگی'' کا فلسفہ اچھا ہے مگر روزمرہ کاروبارِ حیات منّخ کہںّز اس کی عملی شکل نظر نہں آتی۔ ''ادب برائے ادب'' کا نظریہ بھی مشکل سے دوچار ہے کہ قارئین آپ کا ساتھ چھوڑ رہے ہںّ اور نئی نسل ان کے اس عمل کو احسن گردان رہی ہے۔ منںت سمجھتا ہوں کہ اس صورتحال مںّ ہم ''ادب برائے ادیب'' کے نظریے کی طرف پیش قدمی کر رہے ہںّ۔''[۳۳]

اس صورتِ حال منّآ ہمارے سامنے مرثیہ کا مستقبل کیا ہے؟؟؟ کیا ہم محض انیس و دبیر یا کلاسیکی مرثیوں کے ذخیرہ کی بنیاد پر اکیسویں صدی کا سفر مکمل کر کے بائیسویں صدی مں عزت و احترام سے داخل ہو جائنّی گے؟؟ یا ہمنّر صنف مرثیہ کے مزاج و مذاق منّس شعوری طور پر کچھ تبدیلیاں لانا ہوں گی؟؟ اس سلسلے منّخ میرا واضح اور دو ٹوک مؤقف یہ ہے کہ ہمنّے اجداد کے ورثے کا تحفظ کرتے ہوئے مرثیے منّس جدید موضوعات کو ضرور شامل کرنا چاہیے اور اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بنانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ مرثیے کی ہم عصر اصناف منّم رونما ہونے والی تبدیلیوں کو بھی بغور دیکھنا چاہیے۔ اس سلسلے منّدر راقم الحروف چند تجاویز پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہے۔ اُمید ہے کہ ناقدین، محققین اور دانش جُو حضرات ان تجاویز پر غور فرمائں گے۔

۱۔ مرثیے کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے اور اس منّت ایسے موضوعات کو بطورِ خاص شامل کیا جائے جو اکیسویں صدی بلکہ بائوسایں صدی کے عین مطابق ہوں۔

۲۔ جدید اور قدیم مرثیوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے اور مرثیوں کے متون کی صحت کا بطور خاص خیال رکھا جائے تاکہ یہ عظیم ورثہ تلف ہونے سے محفوظ ہو جائے اور درست متن قارئین تک پہنچ سکے۔

۳۔ مرثیہ کے تحفظ اور فروغ کے لیے جدید ٹیکنالوجی سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔ مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کے نام سے ویب سائیٹ بنائی جائنّو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے مستفید ہوں۔

۴۔ میڈیا کے ذریعہ سامعین اور ناظرین کو مرثیہ کی افادیت سے آگاہ کیا جائے اور مرثیوں مں موجود جدید رویوں کو اُجاگر کیا جائے۔

۵۔ مرثیہ کے حوالے سے تعلیمی درس گاہوں اور خصوصاً یونیورسٹیوں منّا، مذاکرے، سیمینارز اور سمپوزیم کا اہتمام کیا جائے۔

۶۔ معروف محققین، ناقدین اور دانشوروں سے استدعا کی جائے کہ وہ اس صنف کے حوالے سے اپنے گراں قدر خیالات تحریری شکل منّے پیش فرمائنّو۔

۷۔مرثیہ کا مشرقی و مغربی اصناف سے موازنہ کیا جائے اور اس کے اختصاصی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔

۸۔ نصاب سازی کے وقت مرثیوں کے مختلف اجزا شامل کیے جائنّک اور ایم۔ اے کی سطح پر مکمل مرثیے کا مطالعہ لازم قرار دیا جائے۔

۹۔ مرثیہ کے حوالے سے کیے گئے اعتراضات کا بغور مطالعہ کیا جائے اور ان کے تشفی بخش جوابات مرتب کیے جائں۔۔

۱۰۔ مرثیہ کو صرف مسدس کی ہیئت کے ساتھ مخصوص نہ کیا جائے بلکہ اسے مرثیہ نگار پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی پسند کی ہیئت اختیار کرے۔

۱۱۔ مرثیہ کو زندہ رکھنے کے لیے نئے سامعین اور نئے قارئین پیدا کرنے کے لیے جست و خیز کی جائے۔

۱۲۔ جدید ذہن کے حامل نوجوان شعرا کو صنفِ مرثیہ کی جانب متوجہ کرنا ضروری ہے کہ اب اس قدیم صنف کو تازہ لہو کی بے حد ضرورت ہے۔

۱۳۔ ایسی محافل اور مجالس کا اہتمام کرنا بھی ضروری ہے جس مں صرف اور صرف کلاسیکی اور جدید مرثیے پڑھے جائیں تاکہ سامعین منک مرثیے کی سماعت کا ذوق بیدار ہو جائے۔

۱۴۔ مرثیہ خوانی کے فن کو تر و تازہ رکھنے کے لیے بزرگوں کی ہدایات کی روشنی منّی نوجوانوں کو آمادہ کرنا چاہیے۔

۱۵۔ معروف مرثیہ نگاروں کو جدید موضوعات یا صورتِ حالات دے کر ان سے مرثیہ لکھنے کی استدعا کی جائے تاکہ موضوعاتی مرثیوں کو فروغ حاصل ہو۔

۱۶۔ معروف مرثیہ نگاروں کے نام سے ایوارڈز کا اجرا کیا جائے۔ عصرِ حاضر کے بزرگ مرثیہ نگاروں کے اعزاز منک تقاریب کا اہتمام کیا جائے اور ان کی ہر ممکن دلجوئی کی جائے۔

۱۷۔ مرثیہ کو کسی فرقے یا مذہبی گروہ سے متعلق نہ کیا جائے بلکہ ہر مذہب اور مسلک کے شاعروں کو اس صنف کی جانب متوجہ کیا جائے۔

۱۸۔ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے شعرا کو بھی آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی مادری یا قومی زبان منّو مرثیے لکھں b۔

۱۹۔ اُردو کے معروف و مقبول مرثیوں کے مختلف زبانوں منّی تراجم شائع کیے جائیّ تاکہ دوسری زبانوں سے آشنا لوگ بھی اس صنف سے کماحقہ، استفادہ کر سکنّہ۔

۲۰۔ حکومت پر زور دیا جائے کہ وہ صنفِ مرثیہ کے لیے علیحدہ سرکاری ایوارڈ کا اعلان کرے۔ اہم مرثیہ نگاروں کے نام سے ٹکٹ جاری کرے اور بڑی بڑی شاہراہوں کے نام اہم مرثیہ نگاروں کے ناموں سے منسوب کرے۔

۲۱۔ بیرون ملک یونیورسٹیوں مں انیس اور دبیر کے نام سے چیئرز کا اعلان کیا جائے تاکہ وہاں کے طلبہ و طالبات بھی مرثیہ نگاروں سے آگاہ ہو سکںِ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اکیسویں صدی منّو مرثیہ زندہ رہے گا؟؟ اس کا سادہ اور آسان جواب تو یہ ہے کہ جب تک حق و باطل کی آویزش جاری رہے گی اس صنف کا ارتقائی سفر اسی آب و تاب سے جاری رہے گا۔ اگر بنظرِ غائر دیکھیں تو صنفِ مرثیہ مںِ مزاج اور ہئیت کے اعتبار سے اتنی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہنّو کہ وہ اکیسویں صدی کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے لہٰذا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ صنفِ مرثیہ کا مستقبل انتہائی روشن اور تابناک ہے۔ اب چلتے چلتے حضرتِ قیصر بارہوی کے مرثیے 'عظمتِ فن' کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے:

پڑھ لیجیے عبارتِ ایوانِ مرثیہ
تزئینِ قصرِ علم ہں ارکانِ مرثیہ
قائل ہوئے صفات نگارانِ مرثیہ
صورت گرِ ادب ہے دبستانِ مرثیہ
بے داغ زندگی کی طلب مرثیے میں ہے
انسانیت کا سارا ادب مرثیے میں ہے

* * *

حواشی

(۱) مجتبیٰ حسین، پروفیسر ''مرثیہ اور عہد جدید'' مشمولہ جدید مرثیہ نگاری از سید وحید الحسن ہاشمی، لاہور، مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۶۷ء، ص ۱۸۴

(۲) گوپی چند نارنگ، سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰

(۳) محمد حسن، ڈاکٹر ''ادبی سماجیات کے نقطۂ نظر سے مرثیے کا مطالعہ'' سہ ماہی ''رثائی ادب'' کراچی، اپریل ۲۰۰۲ U، ص ۱۱

(۴) سلیم اختر، ڈاکٹر ''وحید الحسن ہاشمی کے مرثیے'' مشمولہ ''العطش'' (جلد سوم)، لاہور، الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۲۳۵

(۵) خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، قدیم نظمس، لاہور، بک ورلڈ، ۱۹۶۴ء، ص ۲۷۱

(۶) سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، معروضات، لاہور، پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ۳۷

(۷) صفدر حسین، سدم، ڈاکٹر، مرثیہ بعد انیس، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۱ء، ص ۲۳۔

(۸) عابد علی عابدؔ (دیباچہ)، موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ، لاہور، مجلس ترقی ادب، سن۔ ن، ص ۶۔

(۹) احتشام حسین (مقدمہ)، مراثی انیس مںؔ ڈرامائی عناصر، لکھنؤ: نسیم بکڈپو، ۱۹۵۹ء، ص ۷

(۱۰) شجاعت علی سندیلوی، تعارفِ مرثیہ، الہ آباد، ادارہ انیس اردو، ۱۹۵۹ء، ص ۴۴۔

(۱۱) سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، معروضات، لاہور، پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۳۷۔

(۱۲) عاشور کاظمی، سید اردو مرثیے کا سفر دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء، ص ۶۰۰۔

(۱۳) سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، معروضات، لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۲۲۔

(۱۴) عبداللہ، سید، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، لاہور: خیابان ادب، ۱۹۷۷ء، (طبع دوم)، ص ۱۱۵

(۱۵) احراز نقوی، ڈاکٹر، انیس ایک مطالعہ ، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۲ء، ص ۲۳
(۱۶) محمد حسن، ڈاکٹر، ''ادبی سماجیات کے نقطۂ نظر سے مرثیے کا مطالعہ'' مشمولہ رثائی ادب، کراچی، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ۲۳
(۱۷) ہلال نقوی، ڈاکٹر ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' کراچی، محمدی ٹرسٹ، ۱۹۹۴ء، ص ۷
(۱۸) طاہر حسین کاظمی، ڈاکٹر، اُردو مرثیہ میر انیس کے بعد، دہلی : ایرانین آرٹ پرنٹرز، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۵
(۱۹) احراز نقوی، ڈاکٹر، جدید فنِ مرثیہ نگاری، مرتبہ : وحید الحسن ہاشمی، لاہور، مکتبہ تعمیر ادب، ۱۹۶۷ء، ص ۲۱۲
(۲۰) محمد رضا کاظمی، جدید اُردو مرثیہ، کراچی، مکتبہ ادب ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۔
(۲۱) شجاعت علی سندیلوی، تعارف مرثیہ، الہ آباد، ادارہ انیس اُردو، ۱۹۵۹ء، ص ۷۰
(۲۲) اسد اریب، ڈاکٹر، اُردو مرثیے کی سرگزشت، لاہور: کاروانِ ادب، ۱۹۸۹ء، ص ۸۴۔۸۹
(۲۳) حامد حسن قادری، مختصر تاریخ مرثیہ گوئی، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۰
(۲۴) شجاعت علی سندیلوی، تعارفِ مرثیہ، الہ آباد، ادارۂ انیس اُردو، ۱۹۵۹ء، ص ۸۶
(۲۵) محمد رضا کاظمی، جدید اُردو مرثیہ کراچی : مکتبۂ ادب، ۱۹۸۱ء، ص ۸۶
(۲۶) ضمیر اختر نقوی (مرتب)، جوش کے مرثیے، کراچی، ادارۂ فیض ادب، ۱۹۸۰ء، ص ۲۲
(۲۷) کرار حسین، پروفیسر (پشض لفظ)، مراثی آلِ رضا، کراچی، خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر، ۱۹۸۱ء
(۲۸) عاشور کاظمی، سید اُردو مرثیے کا سفر دہلی : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء، ص ۴۵۴
(۲۹) اسد اریب، ڈاکٹر، اردو مرثیے کی سرگزشت، لاہور، کاروانِ ادب، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۱
(۳۰) صفدر حسین، سید، ڈاکٹر، مرثیہ بعد انیس، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۱ء، ص ۱۷۴
(۳۱) اسد اریب، ڈاکٹر، اُردو مرثیے کی سرگزشت، لاہور: کاروانِ ادب، ۱۹۸۹ء، ص ۸۵
(۳۲) ہلال نقوی، ڈاکٹر (مقدمہ)، لہو لہو کہکشاں، کراچی، ادارہ تقدیس قلم، ۱۹۸۹ء، ص ۲۹
(۳۳) عرفی ہاشمی، بُجھے چراغوں کی روشنی (مرثیے)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۹

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیق و تنقید کا نقطہ مرکزی اور مرغوب موضوع مرثیہ اور مرثیہ گو شعرا رہا ہے، خاص طور پر جدید مرثیہ گو شعراء۔مرثیے کی تحقیق و تنقید ڈاکٹر شبیہ کا امتیازیوں ٹھہرتی ہے کہ رثائی ادب کے سلسلے مں۔ اُن کی اب تک شائع ہونے والی کُتب منّث نصف کے قریب مرثیے کی تدوین، تحقیق، تفہیم اور تفسیر سے متعلق ہں۔۔ اس سلسلے مں۔ انہوں نے متعدد امکانی موضوعات پر مباحث کے در وا کیے ہنّغ۔ انہوں نے لکیر کو نہیں پیٹا بلکہ ایسا فکری موقف اختیار کیا ہے جو مرثیے کے کئی نئے زاویے سامنے لاتا ہےیوں مرثیے کی تفہیم اور اس کے فنی پہلوؤں کو مزید نکھارا ہے۔(محمد شفیع بلوچ کے مضمون رثائی ادب کا ابن خلدون ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن سے اقتباس
مطبوعہ عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد محرم الحرام نمبر۔جنوری ۲۰۰۹ء۔ص ۲۵)

اردو ادب میں مرثیے اور سلام کی حیثیت

تسلیم الہیٰ زلفیؔ (کینیڈا)

سانحۂ کربلا کے حوالے سے اُردو زبان مں مرثیہ اور سلام ایک ایسی صنفِ ادب بن گئی ہے جو کسی دوسری زبان مںا نہںل پائی جاتی۔ میر انیسؔ اور دبیرؔ نے اُردو مرثیے اور سلام کو جس بلندی پر پہنچایا وہ کسی سے پوشیدہ نہںا ہے۔

ہر صنفِ ادب مںا وقت کے ساتھ نِت نئی تبدیلیاں رُو نما ہوئںو اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ مرثیے اور سلام مں کس قسم کی تبدیلیاں ہوئی ہںا۔ اور جدید مرثیہ اور سلام کیا ہے۔ مرثیے اور سلام کو فکری بنیادوں آ گے بڑھانے والے کون ہںج۔ اور مرثیے اور سلام کی ہتئں کی تبدیلیوں سے کیا صورتِ حال بنی ہے۔

کسی بھی صِنفِ ادب کے فروغ کتابں،، رسائل اور ناقدین اہم کردار ادا کرتے ہںر۔ ہم دیکھتے ہںر کہ مرثیہ اور سلام ایک مقبول صِنفِ ادب ہونے کے باوجود امام بارگاہوں تک محدود کر دی گئی ہے۔ ادبی رسائل مںس مراثی اور سلام شامل نہں r کئے جاتے ہںے۔ مختلف شعراء کے مرثیوں اور سلام کے مجموعے شائع ضرور ہوتے ہںہ لیکن اُن کی تشہیر دیگر ادبی کتابوں کی صورت نہیں ہوتی۔ جبکہ ہمارے بیشتر ناقدین اس جانب متوجّہ نہںک ہوتے۔ ان کی لا تعلقی کے اسباب کیا ہںر۔ اور یہ کہ مرثیے اور سلام کی ادب مںہ کیا حیثیت ہے؟

ادب کوئی ایسی مجرّد حقیقت نہںب ہے کہ وہ مُعلّق فضاء مںی لکھا جائے۔ پچھلے ڈیڑھ دو سو برس مں؟ ہمارے معاشرے مں تہذیبی اور سیاسی انداز کی جو تبدیلیاں آئی ہںت اس سے مرثیے اور سلام کی صِنف بھی متاثر ہوئی۔ اگر آپ میر انیسؔ کے بعد کا زمانہ لںب تو جدید مرثیے اور سلام کا تصور جوشؔ صاحب سے قائم ہُوا۔ برِ صغیر کی جنگِ آزادی لڑی جا رہی تھی اور جوشؔ صاحب نے کربلا کو اُس آزادی کے رشتے سے ہم آہنگ کر کے جو مرثیے اور سلام لکھے۔ وہاں سے جدید مرثیے اور سلام کا تصوّر قائم ہُوا۔ اُس سے بہت پہلے ہم اقبالؔ کی شاعری کی طرف متوجّہ ہوتے ہںا تو 'رموزِ بے خودی' سے سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۱۸ ء مںک 'رموزِ بے خودی' شائع ہوئی ہے۔ سلیم چِشتی نے 'رموزِ بے خودی' کی شرح لکھی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ، مںر نے علاّمہ اقبال سے پوچھا کہ آپ فرماتے ہیں

زاتشِ اُو شعلہ ہا اندو ختیم
رَمزِ قرآں از حُسینؓ آمو ختیم

* * *

تو ' رمزِ قرآں ' سے کیا مُراد لیتے ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ تعلیماتِ قرآن کی روح یہ ہے کہ باطل کے خلاف صف آراء ہو جاؤ۔ اِس تناظر میں ' جوشؔ صاحب نے پہلا مرثیہ 'آوازِ حق ' لکھا۔ اُس سے ایک جدید مرثیے کا تصوّر سامنے آیا۔ ۔ اگر ہم عہدِ انیسؔ کا مرثیہ یا سلام پڑھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی اہم واقعہ رُو نما ہُوا ہے۔ میر انیسؔ کا یہ شعر دیکھئے ۔ ۔ ۔ ۔ ؎

آج شبّیرؓ پہ کیا عالمِ تنہائی ہے
ظلم کی گلشنِ زہراؓ پہ گھٹا چھائی ہے

* * *

لیکن آج کا مرثیہ یا سلام پڑھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی عظیم واقعہ رُو نما ہُوا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اُس دَور کا مرثیہ ایک خبر تھا، جبکہ آج کا مرثیہ تجزیہ ہے۔ اُس مرثیے میں حالات کی جنگ ہے، جبکہ آج کے مرثیے میں نظریات کی جنگ ہے۔ جوشؔ صاحب سیدّنا حسینؓ کے کردار کو انسانی حوالے سے دیکھتے ہیں، اور اُسی پر زیادہ زور دیتے ہیں ملاحظہ ہو ۔ ۔ ۔ ؎

دل بھی جھُکتا جاتا تھا سجدے میں پیشانی کے ساتھ
کیا نمازِ شاہ تھی ارکانِ ایمانی کے ساتھ

* * *

ماضی میں جو مرثیے لکھے گئے ان کی تعریف آسان ہے۔ اُن میں ایک سراپا ہے، آمد ہے، رَجَز ہے، رخصت ہے، یہ سب باتیں آتی ہیں۔ مگر آج کا مرثیہ کسی بھی لکھا تھا یہ اُن مرثیوں کے سیاسی محرّکات ہیں اور جوشؔ ہی اُس سیاسی جد و جہد کو مرثیے سے منسلک کرتے ہیں ۔

آپ یہ دیکھیں کہ جتنی نظم نگاری منّی سیاسی شاعری ہوئی ہے، اُسی قدر مرثیے منّس سیاسی فکر نمایاں ہوئی ہے۔ اِس ضمن منّا بعض اہلِ فن کا کہنا ہے کہ مرثیے کو صرف مسدّس ہی منّھ لکھا جانا چاہیے، تو بہت پہلے علاّمہ جمیل مظہری اور حاضر مس ڈاکٹر ہِلال نقوی نے مسدّس کی فارم سے بہت ہٹ کر مرثیے لکھے ہنّر۔ دیکھیے ہِلالؔ نقوی کا انداز۔۔۔۔ ؎

تڑپ کے اُٹھ نہ کھڑے ہوں قتیلِ راہِ وفا
پُکارتا ہے کوئی کربلا کی بستی منّا

* * *

سَمت کا تعیّن نہس کرتا۔ جوشؔ صاحب اپنے مرثیے کو آزادی کی تحریک سے مِلا دیتے ہنّے۔ جبکہ علاّمہ جمیل مظہری کے یہاں فلسفیانہ رنگ ہے۔۔۔۔۔ ؎

کیوں کہوں کہ راہِ حق منّت مظہریؔ دریا نہ تھا
بھیک جو دریا سے لے، اتنا کوئی پیاسا نہ تھا

* * *

لیکن نیمؔ امروہوی کے یہاں بالعموم دینی اِستدلال مِلتا ہے۔۔۔۔ ؎

عشقِ خدا کا بار، نہ کہسار سے اُٹھا
افلاک سے نہ عرشِ ضیاء بار سے اُٹھا
یہ کیا نہ انتہائے خوش اطوار سے اُٹھا
حُسینؑ بے کسَ و بے یار سے اُٹھا
رُخ زَرد آدم و مَلَک و جِن کا ہو گیا
یہ ہو گئے خدا کے، خدا اِن کا ہو گیا

* * *

اور آلِ رضاء کے اعتقاد و ایمان کے یہ تیور ہیۡں۔ ۔۔۔۔ ؂

لغزشیں ہم سے بھی ہوتی ہیں، مگر واہ رے ہم
یا علیؑ کہہ کے سنبھلنے میں مزا آتا ہے

* * *

آج کے مرثیہ و سلام نگار بالکل مختلف انداز سے سوچتے ہیں ۔ کہیۡں سائنسی تجزیہ ہے، کہیں سیاسی بحث ہے اور کہیۡں کربلا کے سماجی پہلو نمایاں ہوتے ہیۡں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ فکری روّیہ کیا ہے۔ میرے خیال میۡں آج کا مرثیہ اور سلام نگار تین کرداروں کے گِرد گھوم رہا ہے : حضرت حسینؑ، بی بی زینبؑ اور حضرت عباسؑ، لیکن جب وہ عونؑ و محمدؑ اور بی بی سکینہؑ کے متعلق لکھتا ہے تو ایک بے بسی سی محسوس ہوتی ہے، وہ اِس انداز کے رَوّیے جدید انداز میۡں پیش نہیۡں کرسکتا ! میرا خیال ہے کہ وہ مرثیہ او رسلام جو مقصدِ شہادت کو واضح طور پر بیان کرتا ہے، وہ واقعتاً مقدّم ہے اور جدید ہے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مرثیے اور سلام میۡں جو واضح تبدیلی آئی ہے وہ دبیرؔا کے بیٹے اوجؔ سے آئی ہے۔ لیکن اوجؔ کا شعر سننے سے پہلے مرزا دبیرؔ کی گھن گرج ملاحظہ فرمائیۡں۔ ۔۔۔۔ ؂

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف، چرخِ کہن کانپ رہا ہے

* * *

اب آتے ہیں مرزا اوجؔ کی طرف، جن کا کہنا ہے کہ۔۔۔۔ ؎

حُسینؓ جہد و عمل میں ہیں، کربلا میں نہیں
وہاں تو صرف چڑھایا تھا آستیوں کو

* * *

یعنی فن برائے فن کا جو تصوّر وابستہ تھا، اُس کو سب سے پہلے اوجؔ نے اور پھر دبیرؔ کے شاگرد شادؔ عظیم آبادی نے توڑا۔ دوسری منزل جوشؔ صاحب کی ہے، انہوں نے اس سیاسی بیداری کو بغیر کسی ابہام کے سیاسی واقعات اور سیاسی جِد و جُہد سے منسلک کیا، لہذا 'آوازِ حق' جوشؔ صاحب نے جَلیانوالہ باغ کے ردِّ عمل مں لکھا تھا۔ یہ ان مرثیوں کے سیاسی محرکات ہیں اور جوشؔ ہی اس سیاسی جدوجہد کو مرثیے سے منسلک کرتے ہیں۔

آپ یہ دیکھیں کہ جتنی نظم نگاری مں سیاسی شاعری ہوئی ہے، اسی قدر مرثیے میں سیاسی فکر نمایاں ہوئی ہے۔ اس ضمن مں۔ بعض اہلِ فن کا کہنا ہے کہ مرثیے کو صرف مسدّس ہی میں لکھنا چاہیے، تو بہت پہلے علامہ جمیل مظہری اور حاضر مں ڈاکٹر ہلال نقوی نے مسدّس کی فارم سے بہت ہٹ کر مرثیے لکھے ہیں۔ دیکھیے ہلال نقوی کا انداز۔۔۔ ؎

تڑپ کے اٹھ نہ کھڑے ہوں قتیلِ راہِ وفا
پکارتا ہے کوئی کربلا کی بستی میں
مئے وِلا کے شرابی شِکستہ حال سہی
خرید لیتے ہیں جنّت کو فاقہ مستی میں

* * *

میں سمجھتا ہوں کہ موضوع ہی صِنف کا تعین کرتا ہے، صِنف موضوع کا تعیّن نہیں کرتی۔ اُردو مں جو مرثیہ ہے، وہ ایک بالکل مختلف صِنف ہے۔ اُردو نے عربی سے مرثیہ ضرور قبول کیا ہے، لیکن اُردو منّہ مرثیہ سیّدنا حُسینؓ اور شہدائے کربلا سے مخصوص کر دیا گیا ہے، اور اِس منّن مرثیہ گو شعراء کوشش کرتے ہنّک کہ سیدّنا حُسینؓ کے اعلیٰ کردار کے حوالے سے اپنی سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی اَقدار کو بلند کریں، اِس لئے کہا جاتا ہے کہ اُردو منّ جو مرثیہ ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ یہ صِنف اگر کسی سے تھوڑی بہت ملتی ہے تو وہ رَزمیہ ہے، لیکن رَزمیے سےیوں مختلف ہے کہ رَزمیے منّت کردار خیالی ہوتے ہنّس، جبکہ مرثیے کے کردار اصلی ہنّہ اور ان کی بہت بڑی اہمیّت ہے۔ دوسری چیزیہ کہ جب آپ جدید مرثیے اور سلام کی بات کرتے ہنّر تو جدید مرثیے اور سلام کا تعلق جدّت سے نہنّر ہے۔ جدیدیت کا سلسلہ ہمارے یہاں اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے جنگِ آزادی اور سرسیّد تحریک شروع ہوئی اور اس مں ہم نے نئے نئے موضوعات جن کی معاشرے منّل ضرورت تھی، انہنّی نثری ادب اور شاعری منّز پیش کرنا چاہا، وہاں سے ہمارا یہ جدید رَوّیہ شروع ہوتا ہے۔ منّب یہ نہںّ کہتا کہ ہماری روایتی شاعری بالکل ہی بے مقصد تھی۔۔وہ اَقدار پر مبنی تھی جس منّے آپ کا طرزِ احساس اَقدار سے متعلق تھا، لیکن اُس کے بعد اَقدار کے بجائے تجربات و مشاہدات شامل ہوئے اور سرسیّد تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ بھی یہی ہے کہ چاروں طرف جو کچھ ہو رہا تھا اُسے موضوع بنایا گیا، وہنّے سے جدید انداز اختیار کیا گیا اور یہ طرزِ احساس مرثیے اور سلام منّک بھی داخل ہُوا۔مرزا اوجؔ نے جو مرثیے کہے ہنّڑوہ سرسیّد تحریک کے موضوعات تھے، لیکن انہوں نے اپنے طرزِ احساس منّف کوئی تبدیلی نہ کی اُن کا طرزِ احساس روایتی تھا، کیونکہ اُن کا طرزِ احساس اَقدار پر قائم تھا۔ جدید حِسیّت کی تعلیم یہ ہے کہ بجائے اَقدار کے ذاتی تجربے پر قائم ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعض باریک بین نقّاد، جوشؔ ملیح آبادی اور علاّمہ جمیل مظہری کے مرثیوں کو بھی اِس لحاظ سے جدید نہں کہتے کہ ان مںَ بھی طرزِ احساس روایتی ہے، اَقدار کے اوپر بنیاد ہے، البتّہ موضوعات نئے ہں جو سرسیّد تحریک کا حصّہ ہنّق۔ ہمارے یہاں جو جدّت آئی ہے وہ ذاتی احساس سے آئی ہے۔

ہم دیکھتے ہنّت کہ سلام کا بنیادی موضوع بھی مرثیے والا ہی ہے، یعنی واقعاتِ کربلا، مصائبِ حُسینؑ و انصارِ حُسین، لیکن غزل کی طرح اس کے منفرد اشعار اور ردیف و قوافی کی پابندی کے سبب اس مں جولانیِ طبع دکھانے کی گنجائش بیحد کم ہوتی ہے۔ البتہ اگر سلام کہنے والا شاعر مشّاق، کہنہ مشق اور فکرِ رسا کا ملک ہو تو وہ اپنی جولانیِ طبع سے سلام منّب بھی قصیدے، مرثیے اور غزل کا لطف پیدا کر دیتا ہے۔ صباؔ اکبر آبادی صاحب کی فکرِ رسا، قادر الکلامی اور کہنہ مشقی نے سلام کو ایک نئی معنویت اور اشاریت دیدی ہے، ان کے سلام پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تشبیہات اور تراکیب محمد ﷺ و آلِ محمد ﷺ کی تعریف کے لئے ہی بنی ہں۔ صباؔ صاحب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ تشبیہات اور الفاظ کے استعمال منّد حفظ مراتب کا بیحد خیال رکھتے ہنّ، وہ جہاں جس کے لئے جو لفظ استعمال فرماتے ہنّی، وہ اس شخص کے لئے خاص معنویت رکھتا ہے، اور اس ماحول و فضاء منّھ اس بات کی بڑی اہمیت ہے۔ اس ضمن منّہ صباؔ صاحب نے سانحۂ کربلا کی کچھ نہایت ہی کڑی اور تکلیف دہ ساعتوں کی کیفیت اور شدّت کو بیان کرنے کے لئے اس کے نفسیاتی پہلو تلاش کئے ہں، جو نہ صرف اس کے تاثّر اور درد انگیزی منّں اضافہ کرتے ہنّا، اس طرح وہ واقعے کی تفصیل بیان کئے بغیر ہی محض اشاروں اور استعاروں کی مدد سے، اس کی مکمل تصویر نگاہوں کے سامنے کھینچ دیتے ہنّک۔ صباؔ اکبر آبادی کے سلام سے تین شعر دیکھئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؂

روزِ عاشور سب نے دیکھا ہے
نوکِ پیکاں پہ پھول کِھلتا ہے

خطِ تقسیم دین و دنیا ہے
اب سمجھئے کہ کربلا کیا ہے

بس شہادت میں ہے حیاتِ ابد
ورنہ جینے کا بھروسا کیا ہے

* * *

اسی طرح ہیئت کی تبدیلی نے بھی مرثیے کو نیا روپ دیا ہے، جس کی مثال خواجہ رئیس احمرؔ اور پرفیسر کرّار حُسین کے صاحبِ زادے شبیہ حیدر ہیںؔ، جنہوں نے مسدّس کی پابندی سے نکل کر آزاد نظم میںؔ مرثیے لکھے، اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ اردو مرثیے نے فکری بنیاد پر بھی بہت ترقی کی ہے۔ علی سردار جعفری اور فیض احمد فیضؔ صاحب نے بھی مرثیے لکھے اور جدید دَور مںؔ مرثیے کو آگے بڑھایا ہے۔ ملاحظہ ہو فیضؔ صاحب کا رنگ۔ ۔۔۔ ؎

مَرکب پہ تنِ پاک تھا اور خاک پہ سَر تھا
اُس خاک تلے جنّتِ فردوس کا در تھا

* * *

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کی دوسری اَصنافِ سُخن کی طرح مرثیے اور سلام کو ادبی حیثیت اور اہمیّت حاصل کیوں نہیں ہے ؟

میں سمجھتا ہوں اِس مں دونوں جانب سے قصور ہے۔ بیشتر مرثیے اور سلام تبلیغی انداز سے لکھے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے وہ محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے ہںو۔ اس منّص آفاقی حوالہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے رسائل منّی مرثیہ اور سلام نگاری پر کثرت سے مضامین لکھے جاتے ہںو، جبکہ ہمارے یہاں اس کا رواج نہںج ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ پاکستان منّ ادبی رسائل کے ۹۸ فیصد پڑھنے والے سُنّی ہں !! مں نے پاکستان کے کسی رسالے مںم جوشؔ سے فیضؔ صاحب تک کی مرثیہ نگاری پر کوئی مضمون نہںؔ دیکھا!۔ فیضؔ صاحب کی ایک کمزور غزل پر بحث ہوتی ہے لیکن اُن کے مرثیے پر توجّہ نہںّ دی گئی۔ ۔اس پر غور کی ضرورت ہے۔

قِصّہ یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد جس نسل نے مرثیہ اور سلام لکھنا شروع کیا اُس مںٕی ایک تبدیلی آئی، ہُوا یہ کہ کسی مُجرّد موضوع کی تشریح روایتی انداز سے کی جاتی ہے۔ ہمارے مرثیہ اور سلام لکھنے والے سمجھنے لگے ہںٕے کہ ہم فطری شاعری کر رہے ہںٕں، جبکہ اُن کو یہ نہںٕے معلوم کہ فطری موضوعات پر شاعری نہں ہوتی، ایک وجہ تو یہ ہے، دوسری چیز یہ دیکھیں کہ عقیدے کی شاعری کا ایک انداز اور روایت رہی ہے، اور ہمیشہ اِن اِصناف مںٕ بلند تر شعراء عقیدے کا اظہار کر کے اسے آفاقی سطح تک لے آتے ہںٕں۔ ۔موضوع رشیدؔ لکھنوی اور جوشؔ ملیح آبادی کا مختلف نہںٕد ہے، لیکن جوشؔ کے مرثیے اسے آفاقی معیار تک لے جاتے ہںٕں۔ در اصل بڑا شاعر ہی کسی بھی صِنف کو آفاقی بنا سکتا ہے، درمیانی اور اُس سے نچلے درجے کا شاعر کسی صِنف کو آفاقی نہںٕں بنا سکتا۔ مرثیہ اور سلام عقیدے کی شاعری ہے، اس مںٕ درمیانے اور نچلے درجے کے شاعر بھی ہوتے ہں اُن کے یہاں عقیدے کا غلبہ زیادہ ہو گا۔ جو شاعر زمانے کی تبدیلیوں پر نظر رکھے گا وہ ہر صِنف کو آفاقی سَمت دینے مںٕں کامیاب ہو سکے گا۔ جیسا کہ ہماری دوسری نسل کے شعراء مںٕں۔ ۔شاہدؔ نقوی، سردارؔ نقوی، شاداں ؔدہلوی، سحرؔ انصاری، اُمیدؔ فاضلی، شاعرؔ لکھنوی وغیرہ ہںٕں۔ یہ درمیانی نسل کم و بیش تقلیدی نسل ہے، درمیانہ دَور تقلیدی دور تھا، یہ لوگ تقلید پر فخر محسوس کرتے ہںٕد، اس مںٕا بڑے قادر الکلام شعراء ہںٕا، لیکن انہوں نے آفاقیت کو کہںٕو بھی استحکام نہیں دیا، اس لئے ایک خلاء پیدا ہُوا۔ ۔اس خلاء کو سب سے زیادہ ڈاکٹر ہلالؔ نقوی نے پُر کای، ان کے بعد احمد نویدؔ، تصویرؔ فاطمہ، عارفؔ امام وغیرہ ہں ۔ یہ لوگ بڑی جدید حِسیّت کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں ۔ اسی طرح ہمارے وہ مقتدر و معتبر اور اہم شعراء کرام جو ربع صدی سے زیادہ عرصے سے برّ صغیر پاک و ہند سے باہر مقیم ہںٕں، اگر مرثیے اور سلام کے حوالے سے ان کی تخلیقی کار کردگی کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہںٕں کہ ماسوائے یورپ کے اوریورپ مںٕا بھی برطانیہ کے کہنے اور اس سنجیدگی اور معیاری سطح پر تخلیقی مظاہرہ نہں ہوا۔ گویا مرثیے اور سلام کے ضمن مںٕ برطانیہ سے مغربی دنیا کی نمائندگی ہو رہی ہے اور یہ نمائندگی کرنے والے عاشورؔ کاظمی اور صفدرؔ ہمدانی ہںٕ۔ ان دونوں شعرائے اہلِ بیت نے، ہر دو اصناف کو فنی اعتبار سے مرثیے اور سلام کی حقیقی ہتںٕم دی ہے اور ہم سمجھتے ہںٕں کہ یہ بہت بڑا کام ہے کہ اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی ہاشمی تک کے مرثیے فنّی اعتبار سے ان کی غزل کے مرتبے کو نہںٕگ پہنچتے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آخر مرثیے اور سلام کو ادب منّہ کیوں شامل نہںّ کیا جاتا، یا اس کی حیثیّت کا تعیّن اب تک کیوں نہںّ ہوسکا، اس کے اسباب منّب نے آپ کے سامنے پیش کر دیئے ہنّا، اور آخر منّت اپنی گفتگو سمیٹتے ہوئے، اُن منّن سے چند اسباب پر قدرے اِختصار کے ساتھ کچھ عرض کرتے ہوئے اپنی بات کو ختم کروں گا۔

ہمارے یہاں مرثیہ اور سلام صرف مجالس منّا پڑھا جاتا ہے اور ادبی رسائل منّت شائع نہں ہوتا، لہذا جو لوگ ان مجالس منّں نہںّ جاتے ہیں وہ ان مرثیوں اور سلاموں سے واقف نہںّد ہو پاتے ہں یہی وجہ ہے کہ مرثیے اور سلام کی تشہیر اُس انداز سے نہیں ہوتی جیسے دیگر اَصنافِ سخن کی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مرثیے اور سلام باقاعدگی سے شائع ہوں اور ناقدین تک پہنچّا تو اس پر گفتگو ہو گی۔ جہاں تک عقیدے کی بات ہے تو ہماری شاعری منّم تصوّف کی شاعری کو صفِ اوّل کی شاعری کہا جاتا ہے۔ تصوّف بھی ایک طرح سے مذہبی اور عقیدے کی چیز ہے، جب یہ مقبول ہے اور ساری بڑی شاعری تصوّف پر ہی قائم ہے اور اہمیّت اختیار کر گئی ہے تو مرثیے اور سلام کو اہمیّت کیوں حاصل نہں ہے !!

اُردو ادب منّا مرثیے اور سلام کا موجودہ مقام اور حیثیت دیکھتے ہوئے منّب تو یہ کہوں گا کہ اگر علامّہ شِبلیؔ نعمانی جیسا جیّد عالِم، میر انیسؔ کے بارے منّم نہ لکھتا تو وہ ادب مں r نہ آتے، وہ بہت بڑے شاعر ہونے کے باوجود محدود ہو کر رہ جاتے۔

مختصر یہ کہ اگر آپ اُردو شاعری کی صِنفِ مرثیہ اور سلام سے مخلص ہیں اور اِسے اُردو ادب مں کوئی مقام اور حیثیت دِلانا چاہتے ہنّا تو ۔ ۔مرثیہ اور سلام لکھنے والوں کو اپنے مرثیے اور سلام لوگوں تک پہنچانے کے لئے سنجیدگی سے سوچنا ہو گا۔

احساسات کی دوہری معنویت کا حسینی شاعر

محمد شفیع بلوچ (جھنگ)

کربلا کے واقعات تاریخِ انسانیت کا وہ عظیم المیہ ہنّو جن منّن ایک طرف جورو جفا کی انتہا ہے تو دوسری طرف حسینیت کے روپ منّل استقامت، عزم، قوتِ عمل، معیارِ قربانی، صبر و قناعت، استغنا و توکل، صفائے قلب، سخاوت، شجاعت، راست بازی اور ثباتِ قدم کی انتہا ہے۔ کرب و بلا منّع حسینؓ کے خون سے توحید کی اک نئی تفسیر لکھی گئی۔ اپنی اثر آفرینی کے لحاظ سے کربلا کے واقعات شروع دن سے ہی تازگی لئے ہوئے ہں ۔ بیدار دُنیا کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں حق و باطل کے معرکے منّس حسینؓ کا نام بطور سچائی اور حق کی علامت کے طور پر نہ پہنچا ہو۔ دنیائے ادب منّش تو حسینؓ اور حسینیت کا شمار نہ صرف مذہبی معتقدات منّہ ہوتا ہے بلکہ تخلیق کاروں کا ہر دو سے ایک اعلیٰ سطح کا مستحکم جذباتی تعلق بھی قائم ہے۔ اس جذباتی تعلق نے پہلے اعتقادی صورت اختیار کی اور بعد منّا رثا اور نوحہ کی یہی کیفیت ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی سلام کی صنف منّف ڈھل گئی جو بالآخر شہدائے کربلا اور بالخصوص حضرت امام حسینؓ کی ذاتِ والا صفات کے رثا اور مناقب کے بیان کے لئے وقف ہو گئی۔

سلام کی روایت عربی اور فارسی سے کہنّا بڑھ کر اُردو منّا پروان چڑھی۔ مذہب و عقیدت سے گہری وابستگی کے باعث اس صنفِ سخن کو اردو منّی قابلِ اعتنا نہنّک سمجھا گیا اور یہ عجب یوں نہنّت کہ مذہبی ادب کے ساتھ شروع سے ہی ایسا سلوک ہوتا آیا ہے، حالانکہ مذہب ایسا لطیف اور پاکیزہ احساس ہے کہ جس کے ساتھ آدمی کا جذباتی رشتہ ہوتا ہے اور مذہب کے خلاف کوئی بھی بات آدمی کو نہ صرف ناگوار گزرتی ہے بلکہ وہ مرنے مارنے پر بھی اُتر آتا ہے کیا سچی مذہبی عقیدت تنگ نظری منّص شمار کی جا سکتی ہے؟ میرے خیال منّر اس لئے نہنّر کہ معتقدات اور محسوسات افراد اور معاشرے دونوں سطحوں پر پائے جاتے ہں اور کسی بھی مہذب معاشرے مں ان کا شمار اعلیٰ اقدار منّو ہوتا ہے۔

مذہبی شخصیات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کےیوں تو کئی اسالیب ہئی تاہم ان مئے انفرادیت کی حامل صنفِ سخن ہے۔ سلام کی ہیئتِ ترکیبی کے پیچھے قصیدے اور مرثیے کے ساتھ ساتھ غزل کی بھرپور روایت بھی موجود ہے۔ غزل کی طرح سلام ایک ایسی صنف ہے جس کے مختلف اشعار مئے متنوع مضامین و خیالات پائے جاتے ہئے۔ سلام کا تشکیلی مزاج غزل سے یوں بھی زیادہ مماثل ہے کہ ممدوح کے اوصافِ حمیدہ کو جس طرح ختطع نظم مئں لایا جا سکتا ہے وہ کسی اور صنفِ سخن مئے اس درجہ ممکن نہں ۔

اس قدر تمہید طولانی کا مقصد مدعا یہ ہے کہ عصر حاضر کے روایت و جدت کے حسین امتزاج کے حامل شاعر محمد منیر حسین گستاخ بخاری کے سلاموں کے بارے مں گفتگو کی جائے جو انہوں نے سیّدنا امام حسینؑ اور دیگر شہدائے کربلا کے بارے مںِ رقم کئے ہئں۔ عقیدت احترام اور محبت کے احساسات کی دوہری معنویت گستاخ بخاری کے ہاں یوں بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ خود ان کا تعلق بھی حسینی خانوادے سے ہے سلام کہنے کے لئے ممدوح کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے ادراک کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر بھی مکمل دسترس حاصل ہونا از بس ضروری ہے اور یہ سب خوبیاں گستاخ بخاری مں بدرجۂ اتم موجود ہئں۔

غزل کی تشکیلی مزاج مئں عشق اور سلام کے تشکیلی مزاج مئں اعتقاد کو بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ گستاخ بخاری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہئں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سلاموں کے زیر مطالعہ مجموعے مں سبھی اجزاء کے علاوہ متغزلانہ ایمائیت بھی پائی جاتی ہے انہوں نے ادبی اور فنی عنصر کو قائم رکھتے ہوئے اپنے سلاموں مںہ منقبتی، مناجاتی اور رثائی گوشے پیدا کئے ہئا اور اپنے معتقدات مئں حمد، نعت اور منقبت وغیرہ کو بھی شامل کیا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے کہتے ہں :

شریعت جب ضرورت مند ٹھہری
تدبر بانٹتا مولا علیؑ ہے

*

بوقت شدتِ کفار گستاخؔ
نبیؐ کا مدعا مولا علیؑ ہے

***

سلام بنیادی طور پر ایک ایسی اعتقادی صنف ہے جس کی تہہ مس رثائی رنگ ہوتا ہے۔ گستاخ بخاری نے اس پہلو کو بھی مد نظر رکھ کر بہت خوبصورت اشعار کہے ہیں :

شب عاشور کا تصور کر
اور پھر کاٹ کر دِکھا اِک رات

*

اہلِ ایمان کا
اس قدر حوصلہ
ریت تپتی ہوئی
خون بہتا ہوا
تھے بہتر مگر
ولولہ لاکھ کا
تجھ کو انسانیت
مِل گیا رہنما

* * *

مرے سجدے کا وقت آنے لگا ہے
بدن جاگیر زخموں سے بھری ہے

*

نوحہ گری ہواؤں میں کس نے اُچھال دی
خواہش ہے کس کی حشر تک مدحت حسین کی

* * *

رثا میں ڈوبے ہوئے یہ متغزلانہ اشعار دیکھیں۔

زبانیں سوکھ کر کانٹا ہوئی ہیں
کہیں سے ابرِ رحمت بار دیکھو

*

بدن زخموں سے گلشن بن چکا تھا
کھلا نہ یوں کہنّچ گلزار دیکھو

*

جتنے بھی کارواں میں تھے حسنِ عمل کے ساتھ
شائق شہادتوں کے قرینے کو لے چلے

*

میں تیرے پاؤں کے نیچے ثواب رکھ دیتا
میرا حوالہ تیری طرح کو بہ کو ہوتا

* * *

رثا کے علاوہ منقبتی اور اخلاقی مضامین کو بھی متغزلانہ آہنگ اور اسلوب منّ بڑے خوب صورت انداز منّا پیش کیا ہے:

کربلا اک مثال ٹھہر گئی
ہوتے ہیں زندگی میں سو صدمات

*

کم ہی اتنے قریب ہوتے ہیں
جیسے شبیر اور خدا کی ذات

*

آپ نے دیکھ تو لیا ہو گا
تھے بہتر کے اک سے احساسات

*

کون گستاخ بھول سکتا ہے
سطوتِ دین اور غمِ سادات

*

درس گستاخ کو دیتی ہے وفائے شبیر
ہر وفادار کا آقا ہے حسینؓ ابن علیؓ

*

نہ کربلا نے چمن میں دیکھو
حسینؓ ہر اک زمن میں دیکھو

*

لہو مں ڈوبے وفا کے جذبے
حسینیت کے بدن میں دیکھو

*

علیؓ کی صورت، نبی کی سیرت
حسینؓ کے بانکپن میں دیکھو

*

حسینؓ تم کو بچا گیا ہے
تم اپنے گستاخ من میں دیکھو

* * *

ذکرِ حسین، گستاخ بخاری کی طرح ہر درد مند دل رکھنے والے کے نزدیک نہ صرف باعث ثواب ہے بلکہ وجہ تکریم بھی ہے اور یہ کیوں نہ ہو یہ حوالہ تو زمان و مکان کی حدوں کو بھی عبور کر گیا ہے۔

حسین صبر و شجاعت میں شاندار رہا
یزید جیت گیا پھر بھی بے وقار رہا

*

فلک سے، عصر سے، انسان سے کب یہ اترے گا
حسینیت کا لہو خلق پر اُدھار رہا

* * *

سلام کی وہ روایت جس نے میر انیس سے سیّد آلِ رضا تک کئی منازل طے کی تھنّب اب ماند پڑتی جا رہی تھی کہ ایک اور سیّد نے زیرِ نظر مجموعے سے سلام کی روایت کی جانب شہدائے کربلا کے عقیدت مندوں کی توجہ مبذول کرا کے اس مں پھر سے تازگی پیدا کر دی ہے۔ مں ان کے لئے دل سے دعا گو ہوں کہ وہ عقیدتوں کا یہ سفر یوں ہی جاری و ساری رکھنک۔

فہرست

جدید اُردو مرثیہ ۳

(چند حقائق، چند معروضات) ۳

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن (لاہور) ۳

حواشی ۲۱

اردو ادب میں مرثیے اور سلام کی حیثیت ۲۳

تسلیم الہیٰ زلفیؔ (کینیڈا) ۲۳

احساسات کی دوہری معنویت کا حسینی شاعر ۳۳

محمد شفیع بلوچ (جھنگ) ۳۳